حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی ؒ کے اساتذہ

از مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

"شمائم امدادیہ" اور "امداد المشتاق" میں حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی کے چھ اساتذہ کا ذکر آیا ہے: مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی[۱]، مولانا ابو الحسن کاندھلوی[۲]، مولانا عبد الرزاق جھنجھانوی[۳]، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری[۴]، مولانا عبد الرحیم نانوتوی[۵]، اور مولانا رحمت علی تھانوی[۶]، عجب اتفاق ہے کہ ان میں اول الذکر پانچ حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے شاگرد ہیں، مولانا رحمت علی کے متعلق اس وقت تک کوئی معلومات نہیں ہیں، خیال ہے کہ جب کبھی ان کے حالات دریافت ہوں گے تو یہ بھی حضرت مفتی الٰہی بخش کے شاگرد نکلیں گے، مولانا عبد الرحیم نانوتوی کے حالات بھی مفقود ہیں، بقیہ چاروں اساتذہ کے کم و بیش حالات ملتے ہیں، مولانا محمد قلندر محدث، اور مولانا عبد الرزاق کے نسبتہً قلیل، اور مولانا ابو الحسن اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے مفصل حالات مل جاتے ہیں۔ ان سب کی زندگی اور خدمات کا مختصر سا خاکہ آئندہ سطور میں آرہا ہے۔

۱؎ شمائم امدادیہ ص ۱۱-۱۴ (لکھنؤ ۱۳۱۳ھ) امداد المشتاق ص ۱۰-۱۲ (تھانہ بھون ۱۳۹۰ھ) ۲؎ شمائم امدادیہ ص ۱۰، امداد المشتاق ص ۹۔ ۳؎ شمائم امدادیہ ص ۱۲-۱۰، امداد المشتاق ص ۱۱-۹۔ ۴؎ شمائم امدادیہ ص ۱۲، امداد المشتاق ۵؎ شمائم امدادیہ ص ۱۱، امداد المشتاق ص ۱۰۔ ۶؎ شمائم امدادیہ ص ۱۰، امداد المشتاق ص ۹

حضرت مولانا سید محمد قلندر محدث جلال آبادی

ایک زمانہ تھا کہ نجیب آباد (جو آج کل ضلع بجنور یوپی کا ایک قصبہ ہے) مجمع علوم اور مرکز علما تھا، نواب نجیب الدولہ کی علم پروری اور قدر دانی کی وجہ سے دور دراز سے علما، اور شریف خاندانوں نے نجیب آباد کا رخ کیا، انہی معزز خانوادوں میں ایک گھرانہ سادات کا بھی تھا جو نجیب الدولہ کی وفات اور ضابطہ خاں کے غوث گڑھ کو مستقر بنا لینے کے بعد غوث گڑھ منتقل ہوا، غوث گڑھ کی تباہی کے بعد یہ خاندان جلال آباد پہنچا، اور وہیں کا ہو رہا، اسی خاندان کے ایک فرد فرید حضرت مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی ہیں۔

مولانا محمد قلندر کی ولادت وطفولیت کی نسبت معلومات دستیاب نہیں، تعلیم شروع سے آخر تک خاتم مثنوی مولانا روم حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی[1] سے حاصل کی،[2] تمام علوم میں اپنے استاذ کا عکس اور مثنیٰ تھے، مولانا محمد قلندر کے یہاں ہر وقت درس و تدریس کا سلسلہ رہتا تھا خصوصًا

---

[1] حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش نشاط کاندھلوی خلف مولانا محمد شیخ الاسلام ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی، متوسلات سے منتہیانہ کتابوں تک حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے پڑھیں اور اکثر اسباق میں حضرت شاہ رفیع الدین اور حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی کے رفیق درس رہے۔

تذکرہ مفتی الٰہی بخش ص۹، مشمولہ اختتام مثنوی (کانپور ۱۳۲۲ھ)، نزہۃ الخواطر ص۲، حالات مشائخ کاندھلہ ص۵ کے مؤلفین اور ان کے بعد کے تمام تذکرہ نگار حضرت مفتی صاحب کے اساتذہ اور تربیت کنندگان میں مولانا محمد مدرس کاندھلوی کا بھی ذکر کرتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ مولانا محمد (ابن ابوالفضل بن قاضی عبداللہ) جو کثرت درس و تدریس کی وجہ سے محمد مدرس مشہور تھے، تقریبًا ساٹھ سال درس و تدریس کا بازار گرم رکھنے کے بعد ۱۰۹۲ھ میں (مفتی الٰہی بخش کی ولادت سے ستر سال قبل) انتقال فرما چکے تھے، (کاغذات اراضی ورثاء مولانا محمد مدرس)

[2] تعلیم کے بعد حضرت شاہ عبدالعزیز کے ارشاد پر نواب نجیب الدولہ کے دربار سے بحیثیت قاضی وابستہ ہوگئے۔ اور ضابطہ خاں کی وفات ۱۱۹۹ھ تک اسی عہدہ پر فائز رہے، اس کے بعد مختلف مقامات پر قیام رہا، اور بہت بڑی تعداد میں طلبہ نے ان سے فیض حاصل کیا، مولانا عبدالحی حسنی نے لکھا ہے: واخذ عنہ خلق لا یحصون بحد وعد۔ ان سے بے حد بے شمار لوگوں نے تعلیم حاصل کی۔ (الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص۱۱۳ (دمشق ۱۹۵۸ء))

ان بے شمار تلامذہ میں سے چند مشہور ترین شخصیات یہ ہیں: ۱۔ مولانا مرزا حسن علی (صغیر) محدث لکھنوی، مولانا

مولانا کا سلسلۂ درس حدیث اس دور کا ممتاز ترین حلقۂ درس تھا، جس میں دور دراز علاقوں کے طلبا بھی شریک رہتے تھے۔

مولانا محمد قلندر علم و فضل، سلوک و معرفت اور اصلاح و تذکیر میں یکساں بلند پایہ رکھتے تھے اور کشف و کرامات میں شہرۂ آفاق تھے، مولف تذکرہ رحمانیہ لکھتے ہیں:۔

"یہ بزرگ بڑے پایہ کے عالم تھے، حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو نسبتِ حضوری حاصل تھی، خواب میں زیارت سے مشرف ہوتے تھے، اپنے علاقہ میں نہایت صاحب کشف و کرامات مانے جاتے تھے، علم و فضل کے ساتھ تقویٰ، نیکی اور پرہیزگاری میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے"[۱]

مولانا محمد قلندر کا ایک خاص وصف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت حضوری ہے، مولانا محمد قلندر ہر روز شب میں اور بیداری میں بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوتے تھے،

مولانا محمد قلندر کی علمی و روحانی صلاحیتوں اور دربار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں شرف حضوری کی وجہ سے اس دور کے علما و مشائخ کی نظر میں خاص احترام اور بے حد وقعت تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) وجیہ الدین صدیقی سہارنپوری، مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، مولانا مغیث الدین سہارنپوری، مولانا محمد حسن رامپوری، مولانا عبدالرحیم نانوتوی، مولانا مظفر حسین کاندھلوی۔

مختلف موضوعات پر تقریباً ساٹھ تالیفات یادگار ہیں، جن میں اہم اور مشہور ترین اختتام قنوی مولانا روم ہے، جو ۱۲۱۶ھ میں وجود میں آیا، اور پہلی بار ۱۲۸۲ھ / ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔

مفتی صاحب شعر و سخن کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، اردو، فارسی کلام کے قلمی مجموعے محفوظ ہیں۔ مفتی الٰہی بخش نے ۵ر جمادی الآخرہ ۱۲۴۵ھ / ۱۳ر اکتوبر ۱۸۲۹ء کو کاندھلہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

[۲] تذکرہ مفتی الٰہی بخش (شامل اختتام قنوی) ص۵۸

حاشیہ صفحہ ہذا۔ [۱] تذکرہ رحمانیہ۔ تالیف مولانا عبدالحلیم انصاری، ص۳۵ (پانی پت، ۱۳۵۵ھ)

مولانا محمد قلندر نے طویل علالت کے بعد سنہ ۱۲۶۰ھ میں وفات پائی، مولانا ابوالحسن حسنؔ نے بطریق تخرجہ تاریخ کہی:۔

چو سید محمد قلندر مُوا — تو دل غم سے ٹکڑے مرا ہوگیا
وہ تھا سید پاک مقبول حق — ہوا اس کے غم میں ہر ایک مبتلا
حسنؔ جب گیا فکر تاریخ میں — تو ہاتف نے بس اس سے کہا
"فقد فاز فوزاً عظیما" حسنؔ! — یہ تاریخ ہے اس کی نصِ خدا
۱۳۸۷

بشرطیکہ اعداد الفاظ نزع
کرے لفظ آیتہ سے لکھ کر جدا[1]
۱۲۷

آخر میں مولانا سید محمد قلندر کے ان چند تلامذہ کا ذکر کیا جاتا ہے جن کی علمی وعرفانی خدمات کے گہرے نقوش ہماری ملی تاریخ میں اس طرح مرتسم ہیں کہ ان کا ذکر کیے بغیر ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی مذہبی اور روحانی تاریخ کا ہر جائزہ ناتمام و نامکمل رہے گا۔ یہ نامور تلامذہ ہیں استاذ العلما مولانا مملوک العلی نانوتوی، مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی، مولانا شیخ محمد محدث تھانوی، اور مولانا غوث علی شاہ قلندر پانی پتی۔

مولانا مملوک العلی نے مولانا محمد قلندر سے کیا تعلیم حاصل کی، اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی ایک عبارت سے مجمل اطلاع ملتی ہے، مولانا لکھتے ہیں:۔

"نیز سنا ہے کہ آپ (مولانا مملوک العلی) نے معقول کا کچھ حصہ مولوی قلندر بخش سے بھی پڑھا ہے"[2]

راقم سطور کو مولانا احمد اللہ کیرانوی کی روایت پہنچی ہے، وہ اپنے استاذ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے نقل کرتے تھے کہ مولانا مملوک العلی نے حدیث کی چند کتابیں مولانا محمد قلندر سے پڑھی ہیں۔

---

[1] بیاض مولانا ابوالحسن ورق ۱۰۹ ب۔ فقد فاز فوزاً عظیما کے کل عدد ۱۳۸۷ ہوتے ہیں، اگر لفظ نزع کے اعداد ۱۲۷ اس میں سے نکال دیے جائیں تو کل ۱۲۶۰ باقی رہ جاتے ہیں اور یہی مولانا قلندر کا سنہ وفات ہے۔

[2] تذکرۃ الرشید مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ص ۱۲ / ج ۱ (طبع اول میرٹھ)

مولانا قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی نے چند اعلیٰ درسی کتابیں اور صحیح بخاری کا ایک تہائی حصہ مولانا محمد قلندر سے پڑھا، مولف "تذکرہ رحمانیہ" لکھتے ہیں:۔

"صاحب سوانح (مولانا قاری عبدالرحمٰن) کو تحصیل علوم کا شوق آپ کے پاس لے گیا، حضرت ممدوح سے آپ نے ثلث صحیح بخاری اور بعض دیگر کتب دینیات پڑھیں۔"[1]

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے مشکوٰۃ کا چوتھائی حصہ مولانا محمد قلندر سے پڑھا، ایک مجلس میں اس تلمذ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

"بعد ازاں بالہام غیبی و بجذبہ لذت کلام نبوی مشکوٰۃ شریف کا ایک ربع قراءۃ عاشق زار رسول انور حضرت مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی پر گزرانا۔"[2]

حضرت میانجیو نور محمد صاحب کی خدمت میں حضرت حاجی امداد اللہ کے حاضر ہونے، اور حضرت میانجیو صاحب سے پہلی ملاقات کا ذریعہ بھی مولانا محمد قلندر صاحب ہی تھے، حضرت حاجی صاحب نے میانجیو نور محمد صاحب کی خدمت میں پہلی حاضری[3] کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

"ایک دن حضرت استاذی مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ نے میرے اضطرار کو دیکھ کر بکمال شفقت و عنایت فرمایا کہ تم کیوں پریشان ہوتے ہو، موضع لوہاری یہاں سے قریب ہے، وہاں جاؤ اور حضرت میانجیو صاحب سے ملاقات کرو، شاید

---

[1] تذکرہ رحمانیہ ص۱۳۳ [2] شمائم امدادیہ ص۷۱، امداد المشتاق ص۱۱

[3] راقم سطور کا خیال ہے کہ حضرت میانجیو نور محمد صاحب کی خدمت میں حضرت حاجی صاحب کی پہلی حاضری غالباً ۱۲۵۸ھ کے آخر میں ہوئی، اس کا قرینہ یہ ہے کہ ۱۲۵۸ھ تک حضرت حاجی صاحب کے پہلے شیخ، حضرت مولانا نصیر الدین نقشبندی حیات تھے، ان کی زندگی میں کسی دوسرے شیخ سے رجوع ہونے کا سوال ہی نہیں تھا، کئی سال حضرت میانجیو صاحب کی تلاش و جستجو میں رہے (شمائم امدادیہ ص۷۱) اور رمضان ۱۲۵۹ھ میں حضرت میانجیو صاحب کا وصال ہو جاتا ہے، میانجیو کا وصال کے وقت یہ فرمانا "میرا ارادہ تھا کہ تم سے مجاہدہ و ریاضت اور لوں مگر مشیت باری سے چارہ نہیں ہے عمر نے وفا نہ کی" (شمائم ص۱۱) اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب میانجیو صاحب کی خدمت میں چند ہی ماہ رہے۔

مقصود دل کو پہنچو، اور اس حیث وبحث سے نجات پاؤ، جناب ایشان فرماتے ہیں کہ
جس وقت حضرت مولانا سے میں نے یہ سنا متفکر ہوا، اور دل میں سوچنے لگا کہ کیا کروں،
آخر بلا لحاظ سواری وغیرہ میں نے فوراً راہ لوہاری کی لی[1]

مولانا شیخ محمد تھانوی موصوف نے معقولات کی کتابیں مولانا محمد قلندر سے پڑھیں، مولانا شیخ محمد تحریر فرماتے ہیں:-

"اما در فن معقول ہم ازیں خاندان عالیشان بذریعہ مولانا الحاج المدرس مولوی مملوک العلی نانوتوی مرحوم، ومولانا الحاج محمد قلندر جلال آبادی مغفور"[2]

مولانا محمد عمر تھانوی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت کی تمام کتابیں مولانا عبد الرحیم تھانوی اور مولانا محمد قلندر سے پڑھیں[3]

مولانا غوث علی شاہ قلندر پانی پتی نے مثنوی مولانا روم کا دفتر اول مکمل، اور دوسرے دفتر کا کچھ حصہ مولانا محمد قلندر سے پڑھا[4]

حضرت مولانا عبد الرزاق جھنجھانوی

حضرت مولانا عبد الرزاق (جو بقول حکیم عبد الرحمن حیرت، اشرف العلماء، امام الاتقیاء، رئیس العلماء اور فخر الحکماء سے یاد کیے جاتے ہیں) شیخ امام بخش بن شیخ شمس الدین جھنجھانوی کے صاحبزادے، اور حضرت مفتی الٰہی بخش کے نواسے اور عزیز ترین شاگرد تھے، درسیات اور طب کی تمام کتابیں حضرت مفتی صاحب سے پڑھیں، رسالہ تنظیم الادویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۲۳ھ میں طب کی کتابیں زیر تعلیم تھیں، مفتی صاحب فرماتے ہیں:-

عبد رزاق ومہدی وقاسم		ہر کہ یادش کند شود طب داں
درس غزل یافتہ اتمام		نفع یارب ازیں رساں بجہاں

۱۲۲۳ھ

[illegible]

---

[1] شمائم امدادیہ ص، امداد المشتاق ص [2] دلائل الاذکار فی اثبات الجہر والاسرار، ص (دہلی ۱۲۷۰ھ) [3] نفحات محمدیہ ص (عثمانی میرٹھ، ۱۲۹۰ھ) [4] تذکرہ غوثیہ منسوب بہ مولانا گل حسن، ص

مولانا عبدالرزاق طب میں بھی یگانۂ روزگار، اور اپنے معاصروں سے ممتاز تھے، نباضی ونبض شناسی میں بڑا نام پایا تھا، عبدالرحمٰن حیرت نے لکھا ہے کہ :-

" وودرفن پزشکی ومرض فہمی گوئے سبقت از ہمہ ربودہ، وودردست اوشفائے علیلان شافی مطلق نہادہ وبردل پاکش غرفہ اسرار نہانی کشادہ بود "۔ [1]	طبابت اور مرض پہچاننے میں اپنے زمانہ کے تمام اطباء سے ممتاز تھے، شافی مطلق نے ان کے ہاتھ میں مریضوں کے لیے شفا رکھی تھی، اور ان کے دل پر علم ومعرفت کے اسرار کھول دیے تھے۔

فنون سپہ گری بنوٹ وغیرہ میں بھی استادانہ مہارت رکھتے تھے، یہ فن نامور خطاط محمد امیر (امیر پنجہ کش) سے حاصل کیا تھا، اور اپنے شاگردوں اور متعلقین کو اس کی تعلیم دیتے تھے، حضرت سید احمد شہید کی تحریک جہاد کے زمانہ میں مجاہدین کی تربیت کے لیے ایک مرکز قائم کیا تھا جس میں فنون سپہ گری کی مشق کرائی جاتی تھی، مولانا عبدالرزاق کو ان فنون میں کس درجہ کمال حاصل تھا اس کا اندازہ حکیم الامت مولانا تھانوی کے اس ملفوظ سے ہوتا ہے، فرمایا :-

"مولانا عبدالرزاق نابینا تھے، لکڑی کے فن میں نہایت کامل تھے، ایک شخص خود اپنا مشاہدہ مجھ سے بیان کرتے تھے کہ ہم چند آدمی حاضر ہوئے، ہماری درخواست پر فرمایا، اب تو میں اندھا ہوگیا لیکن خیر! کچھ تمہاری سمجھ کے مطابق دکھلائے دیتا ہوں، ایک چارپائی پر رومال لیکر الٹے لیٹ گئے، چارپائی کے نیچے دانے ڈلوادیے، ایک چِڑیا آکر چگنے لگی، فرمایا کہ بس اب یہ نکل نہیں سکتی، چنانچہ واقعی نکلنے نہیں دیا، رومال سے قلعہ باندھ لیا" [2]

مولانا عبدالرزاق ہمیشہ شب بیدار رہ کر عبادت وبندگی میں مشغول اور گریہ ومناجات میں مصروف رہتے تھے۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ آخر عمر میں مولانا عبدالرزاق نابینا ہوگئے تھے مگر ضعف وپیری اور معذوری کے باوجود ہمیشہ بغیر کسی رہنمائی اور مدد کے مسجد جاتے تھے، اس حال میں بھی کبھی تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی۔

---

[1] صحیفہ زرّیں عبدالرحمٰن حیرت جھنجھانوی صفحہ ۱۲۱ (لکھنؤ ۱۸۸۴ء) [2] حسن العزیز ص ۲۵۵

نام تنظیم الادویہ کردم کہ شدہ نامہا بنظم بیان[1]

حضرت مفتی الٰہی بخش اور مولانا ابو الحسن کاندھلوی سے مثنوی مولانا روم کا درس لیا، اور زندگی بھر اسی کا مشغلہ رہا، تمام مثنوی حفظ تھی اور بہت ذوق و شوق سے اس کا درس دیتے تھے، اور چاہتے تھے کہ ہر شخص مثنوی شریف پڑھے، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نقل فرماتے ہیں کہ :-

"کوئی راستہ میں آتا جاتا ملتا تو اس سے بھی کہتے کہ آؤ مثنوی پڑھ لو"[2]

مثنوی شریف کے درس میں جوش و مستی سے عجیب حال ہوتا تھا، پڑھنے اور پڑھانے والے دونوں بیخود و مخمور ہو جاتے تھے، خود مولانا عبد الرزاق صاحب فرماتے تھے کہ :-

"جب مثنوی پڑھاتا ہوں تو دنیا و ما فیہا کی خبر نہیں رہتی، اتنا فیض تو کھلا ہوا ہے"[3]

یہ تو استاد کی کیفیت تھی اور شاگردوں کا کیا حال ہوتا تھا اس کی سرگزشت حکیم عبد الرحمٰن حیرت بیان کرتے ہیں :-

"در تعلیم مثنوی معنوی بطرز آگاہ درونان آب ضمیر ہم داوند، در اثنائے ایں تدریس آتش عشق ربانی و جوش و خروش یادیز دانی، و نائرہ محبت و فشور پاک در کانون سینہ بے کینہ ما چناں نہفتہ اندکہ اگر اندکے ازاں شورش بہ دریائے بیاں آرم از تاب جگر گدازش، ہمچو دیگ برد یگداں بجوش آید، و اگر حرفے ازاں در دسینہ فگار آشکارا گویم قلوب دردمنداں از گرمی اثرش بساں آتش جحیم در خروش آید"[4]

اسی جوش و خروش سے تقریباً ساٹھ سال تک درس مثنوی کا سلسلہ جاری رہا، اور بقول حکیم الامت مولانا تھانوی "کم سے کم سو مرتبہ تو پڑھائی ہو گی بلکہ زیادہ"[5]

---

[1] رسالہ تنظیم الادویہ (منظوم)، از حضرت مفتی الٰہی بخش، ص ۳۲ (علی گڑھ ۱۸۹۵ء)

[2] حسن العزیز مرتبہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب ص ۲۵۵ (تھانہ بھون ۱۳۳۳ھ)

[3] حسن العزیز ص ۲۵۵ [4] انشائے فیض حقانی عبد الرحمٰن حیرت جھنجھانوی ص ۱۲۲ (لکھنؤ ۱۸۸۵ء)

[5] حسن العزیز ص ۲۵۵

مولانا عبدالرزاق نے تقریباً ساٹھ سال تک علم وحکمت کا درس دیا، اس عرصہ میں دین ودیانت کی کتنی مشعلیں ان کے دم سے روشن ہوئی ہوں گی۔ فقہ ومعرفت کی کتنی مجلسیں ان کی نسبت سے قائم ہوئی ہوں گی، عرفان الٰہی کا کتنے لوگوں کو سبق ملا ہوگا، تلامذہ میں کیسی برگزیدہ اور ذی استعداد شخصیات رہی ہوں گی، افسوس ہے تاریخ وتذکرے ان کے ذکر سے کیسر خاموش ہیں۔

تلامذہ کی کثیر تعداد کا اس سے اندازہ کیجیے کہ بقول حکیم الامت مولانا تھانوی مثنوی مولانا روم کا درس سو مرتبہ سے زیادہ ہوا، اگر ہر دور میں کم از کم تین شاگرد بھی رہے ہوں تو تین سو تک تعداد پہنچتی ہے، مگر صرف تین شاگردوں کا ذکر ملتا ہے اور وہ شاگرد یہ ہیں:۔

حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی: حضرت حاجی صاحب نے تین مرتبہ پوری مثنوی شریف مولانا عبدالرزاق سے پڑھی، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:۔

"میں نے مثنوی شریف تین بار حضرت مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی پر عرض کی"[1]

حضرت حاجی صاحب کی اہلیہ محترمہ[2] کو بھی مثنوی شریف سے بیحد مناسبت تھی انھوں نے بھی مولانا عبدالرزاق سے مثنوی پڑھی تھی، حکیم الامت مولانا تھانوی ارشاد فرماتے تھے:۔

"حضرت پیرانی صاحبہ نے بھی انھیں سے مثنوی شریف پڑھی تھی، ان کو مثنوی سے بہت مناسبت تھی، حضرت حاجی صاحب سے مثنوی پڑھتے میں علماء سوالات کرتے، حضرت پیرانی صاحبہ پردے کے پیچھے بیٹھ کر سنا کرتی تھیں، بعض اوقات علماء کے سوالات سنکر ان کو ایسا جوش ہوتا تھا کہ فرماتیں کہ جی چاہتا ہے پردہ سے نکل کر تقریر کردوں"[3]

مولانا فتح محمد تھانوی (جلال آبادی) نے بھی مثنوی شریف مولانا عبدالرزاق سے

---

[1] شمائم امدادیہ ص۱ [2] غالباً دوسری اہلیہ محترمہ، بی بی خیرًا مراد ہیں جو حضرت مفتی الٰہی بخش کی نواسی اور مولانا عبدالرزاق کی خالہ زاد تھیں۔ [3] حسن العزیز ص۲۵۵

پڑھی۔ مولانا فتح محمد صاحب کا معمول تھا کہ ہر جمعرات کو عصر کے بعد تھانہ بھون سے جھنجھانہ پیدل روانہ ہوتے جمعہ کے دن تمام دن مثنوی شریف پڑھتے شام کو عصر کے بعد تھانہ بھون آجاتے۔ اس مجاہدانہ تلمذ کی تفصیل حکیم الامت مولانا تھانوی بیان فرماتے ہیں، فرمایا:۔

"مولانا فتح محمد نے کمال کیا، یہاں مدرس تھے جمعرات کو عصر پڑھ کر چلتے، مغرب اور عشا کے درمیان جھنجھانہ پہنچ جاتے، صبح کی نماز پڑھ کر خدمت میں حاضر ہو جاتے ایسے ہی پڑھنے والے ایسے ہی پڑھانے والے، جمعہ کی نماز تک پڑھتے، پھر بعد نماز کے عصر تک پڑھتے، بعد عصر کے وہاں سے چل کر یہاں آجاتے، اخیر میں مولانا عبدالرزاق صاحب نے ان سے کہا بہتر ہے جلد ختم کرلو، کچھ دن کی رخصت لے کر چلے آؤ، چنانچہ رخصت لیکر پہنچ گئے، مثنوی شریف ختم کر کے آئے ہی تھے کہ کچھ دن بعد (مولانا عبدالرزاق کا) انتقال ہو گیا"[۱]

عبدالرحمٰن حیرت جھنجھانوی نے مولانا عبدالرزاق کے دامن میں پرورش پائی تمام تعلیم اور مثنوی شریف کے اسباق مولانا عبدالرزاق سے حاصل کیے[۲]

مولانا عبدالرزاق نے ربیع الاول ۱۲۹۳ھ/اپریل ۱۸۷۵ء میں وفات پائی، کاندھلہ میں مفتی الٰہی بخش کے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ رحمۃ اللہ علیہ

---

[۱] حسن العزیز ص۲۵۵ [۲] افادات فیض رحمانی ص۲۲، شمائم شام افروز، عبدالرحمٰن حیرت صفحہ آخر

الفرقان کی ملکیت و دیگر تفصیلات کے متعلق اعلان

(مطابق فارم ۴ دیکھیے قاعدہ ۸)

مقام اشاعت ______ لکھنؤ
وقفہ اشاعت ______ ماہانہ
ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر کا نام ______ محمد منظور نعمانی
قومیت ______ ہندوستانی
پتہ ______ ۳۱-نیا گاؤں مغربی۔ لکھنؤ ۱

میں محمد منظور نعمانی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین میں بالکل صحیح ہیں۔
(دستخط) محمد منظور نعمانی

حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکیؒ کے اساتذہ

از مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

مولانا ابو الحسن کاندھلوی

مولانا ابو الحسن خلف مفتی الٰہی بخش بن مولانا محمد عرف شیخ الاسلام کاندھلوی، تقریباً ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء میں ولادت ہوئی[1]، والد ماجد سے تعلیم حاصل کی، طب کی تمام کتابیں پڑھیں، اور مثنوی مولانا روم کا درس لیا، مولانا محمد حسن رامپوریؒ[2]، اور مولانا حکیم محمد اشرف

---

[1] مولوی کریم الدین پانی پتی نے ۱۸۴۷ء میں مولانا ابو الحسن کی عمر تقریباً ساٹھ سال بیان کی ہے، اگر یہ تخمینہ صحیح ہے تو غالباً ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۶ء میں ولادت ہوئی ہوگی۔

[2] مولانا محمد حسن بن غلام مصطفیٰ انصاری۔ رامپور ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے، تعلیم حضرت مفتی الٰہی بخشؒ سے حاصل کی، مفصل حالات دستیاب نہیں ہیں۔

حضرت سید احمد شہید سے عقیدت و محبت تھی، ان کی تحریک جہاد سے وابستہ ہو گئے تھے، حضرت سید صاحب کے نہایت قریب اور معتمد افراد میں شمار تھا، بالاکوٹ کی جنگ ذی قعدہ ۱۲۴۵ھ / ۱۸۳۰ء میں شہید ہوئے۔

مولانا محمد حسن کی دو تالیفات ہمارے ذخیرہ کتب میں محفوظ ہیں:-

۱۔ رسالہ امکان و امتناع نظیر، اور رسالہ اصول ستہ (فن حساب میں)

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مولانا محمد حسن انصاری رامپوری، جن کا تحفۃ الابرار جدول ثانی ص۱۹۵، تذکرۃ العابدین ص۵۳ اور انوار العاشقین ص۱۲۶ میں ذکر ہے، دوسری شخصیت ہیں، موخر الذکر نے ۲۰ ذی قعدہ ۱۲۵۹ھ / ۱۰ دسمبر ۱۸۴۳ء میں وفات پائی۔

کاندھلوی شریک درس رہے، تعلیم کس وقت شروع ہوئی اور کب تک جاری رہی، اس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، تاہم صحیح بخاری جمادی الاول ۱۲۲۸ھ/مئی ۱۸۱۳ء میں شروع ہوئی حضرت مفتی الٰہی بخش نے ایک یادداشت میں تحریر فرمایا ہے:-

"چہار شنبہ یازدہم جمادی الاول
۱۲۲۸ھ ابوالحسن و محمد حسن شروع قرأت
صحیح بخاری از اول نمودند، اللہ تعالیٰ
زود تر با تمام رساند۔ آمین یارب العالمین"

بدھ گیارہ جمادی الاول ۱۲۲۸ھ کو
ابوالحسن اور محمد حسن نے شروع سے صحیح
بخاری پڑھنی شروع کی اللہ تعالیٰ
جلد پورا کرائے۔ آمین۔

لہ مولانا حکیم محمد اشرف کاندھلوی خلف مولانا امام الدین بن مولانا محمد عرف شیخ الاسلام، تمام علوم متداولہ مفتی الٰہی بخش سے حاصل کیے، تفسیر، فقہ، اور فلسفہ خاص موضوع تھے۔ مرض فہمی اور نبض شناسی میں شہرہ آفاق تھے، طب کی کتابوں کا درس بھی دیتے تھے، عبدالرحمٰن حیرت نے لکھا ہے کہ طب میں ان کے شاگرد ہندوستان کے اطراف واکناف میں پھیلے ہوئے ہیں۔ (سفینۂ رحمانی ص۱۰ لکھنؤ ۱۸۸۴ء)

مولانا حکیم اشرف حضرت سید احمد شہید سے تعلق رکھتے تھے، کچھ دن قافلہ مجاہدین کے ساتھ رہے، مولانا شاہ عبدالحئی بڈھانوی کے وصیت نامہ کی تحریر کے وقت جو حضرات موجود تھے ان میں ایک نام "فضیلت پناہ کیاست دستگاہ حکیم محمد اشرف کاندھلوی" کا بھی ہے (مکاتیب سید احمد شہید۔ ورق ۳۵۔الف لاہور ۱۳۹۵ھ) اخیر عمر میں حضرت میانجیو نور محمد جھنجھانوی سے بیعت ہو گئے تھے۔

حکیم محمد اشرف شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے تھے، اردو فارسی میں کلام کا بڑا ذخیرہ تھا، جو ضائع ہو گیا ہے۔ نظم کا مطبوعہ نمونہ "تفسیر سورۂ یوسف" ہے، اس کا پہلا ایڈیشن ۱۲۴۰ھ میں شائع ہوا۔ (قرآن نمبر سیارہ ڈائجسٹ لاہور ص ۹۴۵/۲) اس کے بعد سے اس وقت تک یہ کتاب برابر چھپتی رہی ہے۔

طب میں حکیم محمد اشرف کی وسعت نظر کا شاہکار، فارسی میں ضخیم تصنیف "بحرالعلاج" ہے قلمی نسخہ ہمدرد انسٹی ٹیوٹ لائبریری دہلی میں محفوظ ہے۔

مولانا محمد اشرف نے ۲۰ ربیع الثانی، ۱۲۴۷ھ/اکتوبر ۱۸۳۱ء میں خانپور ضلع بلند شہر میں وفات پائی، نزہۃ الخواطر ۷/۴۲۶، (حیدرآباد ۱۳۷۰ھ) میں مولانا کا سنہ وفات ۱۲۴۰ھ بیان کیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

تعلیم کے بعد سلسلہ ملازمت میں داخل ہوئے۔ اور میرٹھ میں منصرم بندوبست مقرر ہوئے۔ ملازمت کے ایام میں چند اور مقامات پر بھی قیام رہا والد ماجد کی وفات کے بعد ملازمت ترک کر کے وطن آ گئے، اور گھر پر درس کا سلسلہ جاری کیا، صرف اکبر[1] سے صحیح بخاری تک ۱۶ فنون کی ۶۰ کتابیں نصاب میں شامل تھیں۔ طب کا نصاب اس کے علاوہ تھا، بعض کتابوں کے سال میں کئی کئی دور ہو جاتے تھے[2] جس سے طلباء کی کثرت اور درس کی مقبولیت کا علم ہوتا ہے، مثنوی مولانا روم کے درس کا بھی خاص اہتمام تھا۔

والد ماجد سے بیعت تھے، اور ان سے اجازت وخلافت بھی حاصل تھی، لیکن متعلقین کے اصرار کے باوجود کبھی کسی کو بیعت نہیں کیا، درس وتدریس سے فارغ وقت خلوت میں عبادت وریاضت میں گزارتے تھے، ہر سال شعبان اور رمضان دو مہینے مسجد میں اعتکاف کا معمول تھا، اس معمول کے آخر وقت تک پابند رہے۔

مولانا ابوالحسن خوب صورت، خوب سیرت، خوش اخلاق، اور خوش مزاج بزرگ تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کے حسن اخلاق اور خوش مزاجی کی تعریف کی ہے، مبتلا میرٹھی (جو مولانا سے ان کے میرٹھ میں قیام کے وقت سے واقف اور ان کے دوست بھی تھے) مولانا کا ان الفاظ میں تعارف کراتے ہیں:۔

"ابوالحسن حسن، جوان خوبرو، وخوش خو، ورنگین طبع"[3]

میر محمد خاں سرور[4]، اور کریم الدین پانی پتی[5] نے بھی مولانا کی خوش خلقی کا ذکر کیا ہے۔

۱؎ صرف اکبر، قواعد صرف پر فارسی میں حضرت مفتی الٰہی بخش کی بہت جامع تالیف ہے، یہ کتاب مولانا ابوالحسن اور حکیم محمد اشرف کو صرف میر کے بعد پڑھانے کے لیے تالیف کی گئی اور ہمارے خاندان میں کئی نسلوں تک اس کو صرف میر کے بعد پڑھانے کا معمول رہا۔

۲؎ یہ تمام معلومات مولانا حسن کی مختلف تحریرات سے لی گئی ہیں، مولانا کی تحریرات میں اس نصاب کی تفصیل بھی موجود ہے۔

۳؎ طبقات سخن مبتلا میرٹھی (فوٹو مملوکہ ایوان غالب لائبریری نئی دہلی)

۴؎ عمدۂ منتخبہ ص۲۱۵ ص۳۱۶ (دہلی ۱۹۶۱)

۵؎ طبقات الشعرائے ہند کریم الدین پانی پتی ص۴۳۴ (دہلی ۱۸۴۷ء)

مولانا ابوالحسن خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے، ترجمہ منظوم مثنوی مولانا روم متعدد عارفانہ مثنویاں، چند قصیدے اور ایک رسالہ جہادیہ ان کی یادگار ہے۔ ہر چند کہ ادبی اور لسانی نقطہ نظر سے مولانا احسن کا شمار صف اول کے شعراء، اور اہل کلام میں نہیں ہے، مگر مولانا نے اپنی شاعرانہ صلاحیت، سیدھے سادے کلام، اور پرتاثیر مثنویوں سے جو کام لیا، اور اس کے ذریعہ عشق الٰہی کی جو چنگاری روشن کی اس سے بے شمار اہل دل کے سینے منور ہوئے، اور بہت سی سعید روحوں کو معنیٰ کی دنیا کی طرف رہنمائی ہوئی، اس حیثیت سے ان کے کلام اور مثنویوں کی اہمیت بلند پایہ شعری مجموعوں اور ادبی نوشتوں سے بہت بلند ہے۔

مولانا ابوالحسن کے شاعرانہ کمالات کا نمونہ، ان کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ مثنوی مولانا روم کے دفتر اول کے منظوم ترجمہ "مجمع فیض العلوم" کی تکمیل ہے، یہ منظوم ترجمہ حضرت مفتی الٰہی بخش نے شروع فرمایا تھا، صرف ایک ہزار شعروں کا ترجمہ ہوا تھا کہ کام درمیان میں رہ گیا، اور مصروفیات کی وجہ سے اس کی تکمیل کا موقعہ نہیں مل سکا، اسی میں حضرت مفتی صاحب کا انتقال ہو گیا۔

مفتی صاحب کے انتقال کے بعد احباب کے اصرار پر مولانا ابوالحسن نے "حکایت بادشاہ جہود دیگر کہ در ہلاک دین عیسیٰ علیہ السلام سعی نمود[1]" سے ترجمہ شروع کیا، اور پہلے دفتر کی تکمیل کی[2]، اور حق یہ ہے کہ ترجمہ کا حق ادا کر دیا، اصل کی تاثیر اور تمام سوزش و سرمستی ترجمہ میں منتقل ہو گئی ہے۔ اس ترجمہ کے متعلق کریم الدین کے اس قول میں کوئی مبالغہ نہیں، کہ ایسے ترجمے کم ہوتے ہیں[3]" یہ ترجمہ ۲۱ر جمادی الثانی ۱۲۵۲ھ / اکتوبر ۱۸۳۶ء میں اور گارساں دتاسی کے قول کے مطابق ۱۸۴۵ء میں کلکتہ سے شائع ہوا[4]، دوسرا ایڈیشن

---

[1] مثنوی مولانا روم۔ دفتر اول ص۶۳ (نامی کانپور)

[2] مولانا جعفر تھانیسری کا یہ بیان درست نہیں کہ "مولوی ابوالحسن نے اور ایک ہزار شعر کا ترجمہ کیا تھا کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا" (سوانح احمدی یا تاریخ عجیبہ ص۱۰۲ اسا ڈھورہ) [3] طبقات الشعرائے ہند ص۳۹۳ (دہلی، ۱۸۴۸ء)

[4] خطبات گارساں دتاسی ص۱۰۳ (اورنگ آباد ۱۹۳۵ء)

۱۲۸۱ھ میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے نکلا۔

یہاں مثنوی مولانا روم کے چند شعر اور ان کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے جس سے ترجمہ کے حسن اور معنویت کا اندازہ ہو گا:۔

ترجمہ	فارسی مثنوی
اس بلا کے بعد جو تھی لا دوا	بعد ازیں خوں ریز درماں ناپذیر
یعنی تزویر وزیر پر دغا	کاندر افتاد از بلائے آں وزیر
اک ہوا پیدا یہودی بادشاہ	یک شہ دیگر ز نسل آں جہود
قوم عیسیٰؑ کو لگا کرنے تباہ	در ہلاک قوم عیسیٰؑ رو نمود
چاہے ہو اس حال پر تجھ کو عروج	گر خبر خواہی ازیں دیگر خروج
پڑھ لے سورہ والسماء ذات البروج	سورہ بر خواں والسماء ذات البروج
جو طریقہ پہلے نے جاری کیا	سنت بد کز شہ اول بزاد
دوسرا بھی راہ پر اس کی چلا	ایں شہ دیگر قدم بروے نہاد
جس نے یہاں جاری کیا ایک کام بد	ہر کہ او بنہاد ناخوش سنتے
لائق نفریں ہوا وہ تا ابد	سوئے او نفریں بود ہر ساعتے

مولانا کی طبع زاد مثنویوں میں پہلی مثنوی "بحر الحقیقت" ہے، "بحر الحقیقت" بڑی پر تاثیر اور عارفانہ مثنوی ہے۔ اس میں مثنوی مولانا روم کے طرز پر تمثیلی حکایتوں کے ذریعہ آدمی کو اس کی زندگی کا مقصد یاد دلایا گیا ہے۔ اس مثنوی کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:۔

تیرے قبضے میں ہے سب پست و بلند	اے خدا اے قادر بے چون و چند
کمتریں بخشش تیری دونوں جہاں	اے خدا مطلوب جان عاشقاں
درد سے اپنے مجھے شیدا بنا	اے خدا اے خالق ارض و سما

یہ مثنوی سنہ بارہ سو پچاس میں لکھی گئی، اور انہی ایام میں شائع ہوئی، مطبع قادری میرٹھ سے اس کا ایک ایڈیشن ۱۲۶۵ھ / ۱۸۵۰ء میں چھپا تھا مگر یہ پہلا ایڈیشن نہیں ہے یہ مثنوی اس سے پہلے بھی شائع ہو چکی تھی۔

لے صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات محمد عتیق صدیقی مسلم علی گڑھ ۱۹۶۲ء

مولانا کی مشہور ترین مثنوی "مثنوی گلزار ابراہیم" ہے، اس مثنوی کو مصنف نے مثنوی بحر الحقیقت کا دوسرا دفتر قرار دیا ہے، تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار کی یہ مثنوی ۱۲۵۱ھ میں لکھی گئی، اس میں حضرت ابراہیم بن ادہم کا مشہور زمانہ واقعہ نظم کیا گیا ہے، حضرت ابراہیم کے والد ماجد حضرت ادہم کے بلخ کی شہزادی پر عاشق ہونے کی داستان سے مثنوی شروع ہوتی ہے، اس واردات محبت کی مفصل سرگزشت، پھر اس فقیر بے نوا ادھم کا بادشاہ بلخ ہونا ان کے صاحبزادے ابراہیم کی پیدائش، ان کی تخت نشینی اور اور آخر میں ابراہیم ابن ادھم کے تخت و تاج چھوڑ کر جذب و معرفت کی دنیا میں گم ہو جانے کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

مصنف نے مزے لے کر یہ فسانۂ محبت دہرایا ہے، وہ اس کہانی کو بیان کرتے ہوئے ڈوب ڈوب کر ابھرتے ہیں، اور ہر مرتبہ عرفان الٰہی اور حق شناسی کے دُرِّ نایاب لیکر آتے ہیں، اور چھوٹی چھوٹی بظاہر بے حقیقت باتوں سے عجیب نتائج اخذ کرتے ہیں، اور اس قصہ کے ایک ایک جز میں معرفت کا سبق اور عشق و محبت کی چاشنی تلاش کر لیتے ہیں، یہی وہ عشق قصۂ ابراہیم سے ربّ ابراہیم کی طرف لے جاتا ہے، یہاں پہنچکر قاری مادی چیزوں کی بے ثباتی و بے وقعتی اور عشق الٰہی کی خاص کیفیت محسوس کرتا ہے، اور یہی اس مثنوی کا خاص مقصد ہے۔

اس مثنوی کے ذریعہ بہت سے اہل حق معرفت کے کوچہ سے روشناس ہوئے۔ اور سینکڑوں اشخاص کو علم باطن کی دولت ملی، "گلزار ابراہیم" کے اس خاص وصف کا اکابر علما، اور ممتاز مشائخ نے برملا اعتراف کیا ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہیؒ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ:

"مجھے اس طریق معرفت و سلوک کا ذوق اسی مثنوی سے پیدا ہوا"[1]

مثنوی گلزار ابراہیم مصنف کی حیات میں کئی بار شائع ہوئی، اور آج تک برابر چھپ رہی ہے، اس کے بے شمار ایڈیشن نکلے اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، سینکڑوں قلمی نقلیں تیار ہوئیں اور ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئیں، برصغیر ہند و پاک اور یورپ کے متعدد کتب خانوں میں

---

[1] مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ص۳۵ دوسرا ایڈیشن)

اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔

یہاں یہ اطلاع مناسب ہوگی کہ مذکورہ بالا تینوں مثنویوں کے خطی نسخے مصنف کے قلم سے ہمارے ذخیرہ کتب میں موجود ہیں۔

"مثنوی سمجھ بوجھ" دو سو دو شعروں کی یہ مثنوی گلزار ابراہیم کی طرح مفید و موثر ہے، اس کی سطر سطر میں عشق الٰہی کی لہریں جوش مارتی ہیں۔ یہ مثنوی عرصہ تک سلوک کے ابتدائی نصاب میں داخل رہی۔ مشائخ اپنے مریدین کو اس کو ورد میں رکھنے کی ہدایت و تاکید فرمایا کرتے تھے۔ اس مثنوی کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:۔

خدا کی حمد کر اے اہل غفلت — کہ تا نازل ہو تجھ پر اس کی رحمت
جو اس کے خوف سے توبہ کرے گا — اسے جنت میں گھر بے شک ملے گا
کرے جو نعت احمد صدق دل سے — خدا عقبیٰ میں راحت اس کو بخشے
وہ مقبول خدائے ذوالمنن ہے — شفیع عاصیاں وہ بے سخن ہے
سب اس کی آل اور اصحاب ہیں نیک — وحید العصر ہے ان میں سے ہر ایک

اور خاتمۂ کلام ان اشعار پر ہوا ہے:۔

سمند خامہ کی اپنی عناں روک — خموشی ہے بھلی کام و زباں روک
سمجھ کچھ تو بھی اس کے مدعا کو — سمجھ بوجھ اس کا ہے نام اے خدا جو

یہ مثنوی پہلی بار مطبع احمدی دہلی سے، ۱۲۰۱ھ میں شائع ہوئی[1]۔ اس کے بعد مختلف مطابع نے متعدد ایڈیشن شائع کیے، غالباً تیس چالیس سال سے اس کا کوئی ایڈیشن نہیں آیا ہے۔

مثنوی خنجر عشق۔ مولانا حسن کی اس مثنوی کا کوئی نسخہ ہماری نظر سے نہیں گزرا ہے، یہ مثنوی ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں سعادت یار خاں رنگین کی مثنوی چار باغ کے حاشیہ پر چھپی۔ اس ایڈیشن کے سرورق پر یہ عبارت تھی:۔

"تصنیف سعادت یار خاں رنگین مسماۃ بہ چار باغ، و دیگر مثنوی طبع زاد مولوی ابو الحسن صاحب معروف بہ خنجر عشق۔ حسب فرمائش محمد نظام الدین سوداگر ساکن کول، در مطبع مصطفائی محمد حسن خاں طبع نمود"[2]

---

[1] صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات از جناب محمد عتیق صدیقی ص ۱۹۹ (علی گڑھ ۱۹۶۲ء)

ڈاکٹر گیان چند جین کے قول کے مطابق اس مثنوی کا پہلا شعر یہ ہے:-

پہلے ہے حمد خداوند جہاں جس نے سب پیدا کیا کون و مکاں[1]

مولانا ابوالحسن کو حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی سے بے انتہا عقیدت و محبت اور ان کی تحریک جہاد سے بڑی دلچسپی اور گہری وابستگی تھی، مولانا نے حضرت سید صاحب کی سفر حج سے واپسی کے موقعہ پر ایک "طویل قصیدہ" پیش کیا تھا، اور ایک منظوم "رسالہ جہادیہ" بھی تحریر فرمایا تھا، قصیدہ مولانا کے قلم سے ان کی بیاض میں ہے[2] اور رسالہ جہادیہ جناب غلام رسول مہر نے جماعت مجاہدین میں نقل کیا ہے[3]۔

مولانا ابوالحسن کی بعض یادداشتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنے اردو اور فارسی کلام کے دو دیوان مرتب کیے تھے۔ ان دونوں کا کوئی سراغ نہیں مل سکا، تاہم مولانا کی بیاض میں ان کے کلام کا کچھ حصہ محفوظ ہے۔

مولانا حسن کی نثری تالیفات میں دو کتابوں کا سراغ ملتا ہے: "حل الغوامض" اور "رسالہ بحران" اول الذکر عربی میں تھی دوسری فارسی میں ہے۔

"حل الغوامض" فرائض (میراث) کے موضوع پر نہایت ضخیم اور جامع کتاب تھی، مولانا محمد سلیمان کاندھلوی نے اس کا سنہ تالیف ۱۲۲۰ھ بیان کیا ہے[4] اگر ان کی یہ اطلاع درست ہے تو اس سے مولانا حسن کی اعلیٰ علمی استعداد اور ذہنی صلاحیت کا علم ہوتا ہے۔ اس تالیف کے وقت مولانا حسن کی عمر انیس بیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس عمر میں فرائض کے مشکل موضوع پر ضخیم کتاب کی تالیف ان کی قابلیت و بصیرت کی گواہ ہے۔

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں - ڈاکٹر گیان چند جین ص ۴۴۵ (علی گڑھ ۱۹۶۹ء)

[2] اس قصیدہ کے منتخب اشعار مولوی جعفر تھانیسری نے سوانح احمدی ص ۶۶ تا ص ۶۹ (ساڈھورہ) میں جناب غلام رسول مہر نے سید احمد شہید ص ۲۴۲ تا ص ۲۴۳ جلد اول میں، اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سیرت سید احمد شہید ص ۳۷۶ تا ص ۳۸۰ جلد اول (لکھنؤ، ۱۳۹۵ھ) میں نقل کیے ہیں۔

[3] جماعت مجاہدین ص ۲۹۹ تا ص ۳۰۴ (لاہور)

[4] حالات مفتی الٰہی بخش - تالیف و تحریر مولانا محمد سلیمان کاندھلوی م ۱۳۲۵ھ / ۱۹۰۰ء

فرائض پر مولانا کی گہری نظر کا اس تحریر سے بھی اندازہ ہوتا جو مولانا نے حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے ایک فتویٰ میراث کی تصحیح کے لیے لکھی تھی، یہ تحریر حضرت قاضی صاحب کو بھیجی اور درست سہامات سے مطلع کیا، حضرت قاضی صاحب نے اس اصلاح کو قبول فرمایا، قاضی صاحب کا فتویٰ، اس پر استدراک، اور قاضی صاحب کا رجوع، یہ تمام تحریرات مولانا ابو الحسن نے حل الغوامض میں نقل فرمائی ہیں۔ اس اہم کتاب کا کوئی نسخہ ہمارے علم میں نہیں ہے۔

رسالہ بحران۔ طب یونانی میں بحران کی بحث مشکل اور دقیق بحث سمجھی جاتی ہے، اسکی تحقیق و توضیح کسی ایک کتاب میں نہیں ملتی تھی۔ طب پڑھنے والے اس بحث کی تحقیق و تفصیل کے لیے مولانا ابو الحسن سے رجوع کرتے تھے۔ مولانا نے اس بحث پر معلومات کی کمیابی کو محسوس کیا اور یہ کتاب تالیف فرمائی۔ مولانا نے کتاب کی تمہید میں لکھا ہے کہ:۔

"اکثر دوستوں کو طب کی تعلیم کا ذوق ہے اور وہ اپنے شبہات دور کرنے کے لیے میرے پاس آتے ہیں، خصوصاً بحران کے سبب، اس کے علاج، اور اس کی تفصیلات معلوم کرنے کا ہر ایک کو شوق ہے، مگر اس کے متعلق انھیں اطمینان اور صحیح معلومات حاصل نہیں ہوتے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک کسی نے بحران کے مسائل کی تحقیق اور اس کے مباحث کی وضاحت نہیں کی، اس لیے اس بے بضاعت نے اس کی تحقیق شروع کی اور کتب متداولہ جیسے سدیدی، نفیسی، نزہۃ الارواح، اور ذخیرہ خوارزم شاہی سے رجوع کیا۔ اور بعض مباحث کی تحقیق علم ہیئت، علم طبعیات، اور علم ریاضی کے ذریعہ حاصل کی۔ اور والد ماجد مولانا مفتی الٰہی بخش سے اس کے متعلق جو کچھ سنا تھا وہ سب بھی اس تالیف میں جمع کر دیا ہے۔ امید اہل علم کو پسند آئے گی۔[1]

اس کتاب میں مصنف نے بحران کی علامات و کیفیات، بحران پیدا ہونے کے اسباب، اس کا موسم اور اس کے علاج پر مفصل بحث کی ہے۔ یہ اہم کتاب غالباً کبھی شائع نہیں ہوئی، مگر کثرت نقل سے بڑی حد تک اشاعت نہ ہونے کے نقصان کی تلافی ہو گئی ہے، مصنف کا نسخہ ہمارے ذخیرہ کتب میں محفوظ ہے۔

---

[1] اصل عبارت فارسی میں ہے۔ یہاں ہم لفظی صحیح عبارت کا مفہوم پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کریم الدین پانی پتی نے مولانا حسن کی تالیفات مثنوی بحر الحقیقت، اور گلزار ابراہیم کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:-

"سننے میں آیا ہے کہ ان کی تصنیف سے اور رسالے بھی اردو میں ہیں۔"[۱]

مگر اس تحقیق کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان رسائل سے "مثنوی جدو جہد" اور "خنجر عشق" مراد ہیں یا کچھ اور بھی رسالے تھے جو ہم تک نہیں پہنچے؟

تلامذہ

مولانا کے یہاں کم و بیش بیس سال تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر حیرت ہے کہ مولانا کے کسی شاگرد کا تذکرہ نہیں ملتا۔ صرف حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مثنوی مولانا روم میں تلمذ کی روایت ملتی ہے، حضرت حاجی صاحب نے مثنوی کے بعض حصے مولانا سے پڑھے تھے، حضرت حاجی صاحب کا ارشاد ہے:-

"میں نے مثنوی شریف تین بار حضرت مولانا عبد الرزاق پر عرض کی اور تحقیق بعض مقامات کی مولوی ابو الحسن کاندھلوی سے کی۔"[۲]

اور مولانا ہدایت اللہ فارسی سورتی کو حضرت مولانا سے اجازت حدیث حاصل تھی۔[۳]

مولانا ابو الحسن نے ۱۲ر جمادی الثانی ۱۲۶۹ھ/۲ر مارچ ۱۸۵۳ء بروز چہارشنبہ کاندھلہ میں وفات پائی۔ اور اپنے والد ماجد کے قریب دفن ہوئے۔[۴]

---

[۱] طبقات الشعرائے ہند مولوی کریم الدین ص۴۳۴ (دہلی ۱۸۴۷ء)

[۲] شمائم امدادیہ ص۱۰۱ (لکھنؤ ۱۳۱۴ھ) امداد المشتاق ص۹۱ (تھانہ بھون ۱۳۹۰ھ)

[۳] مولانا ہدایۃ اللہ بن عبد اللہ حنبلی فارسی سورتی۔ ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے، مختلف نامور علماء سے تعلیم حاصل کی اور اس دور کے مشہور علماء کی ایک بڑی جماعت سے اجازت حدیث حاصل کی۔ متعدد زبانوں سے اہل زبان کی طرح واقف تھے۔ عرب ملکوں، یورپ، امریکہ وغیرہ کی سیاحت کی ۱۳۳۵ھ میں حیدرآباد دکن میں وفات ہوئی۔ نزہۃ الخواطر ص۵۲۲/۸۔

[۴] سفینہ رحمانی عبد الرحمن حیرت جھنجھانوی ص۱۳۴ (لکھنؤ ۱۸۸۴ء) تذکرہ مفتی الٰہی بخش فارسی، شامل اختتام مثنوی مولانا روم (کانپور) نزہۃ الخواطر ص۱۰/۷ (حیدرآباد ۱۳۷۹ھ) اور حالات مشائخ کاندھلہ مولانا احتشام الحسن کاندھلوی (دہلی) میں مولانا ابو الحسن کے مختصر حالات ملجاتے ہیں۔

حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکیؒ کے اساتذہ

از مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

(تیسری اور آخری قسط)

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری

سہارنپور کے انصاری خاندان میں جو اپنی دینی خدمات اور برگزیدہ شخصیات کی وجہ سے معروف ہے تقریباً ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء میں حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی ولادت ہوئی۔ سلسلۂ نسب اس طرح ہے۔

مولانا احمد علی بن شیخ لطف اللہ معروف بہ پیر بخش بن شیخ محمد جمیل معروف بہ شیخ جوہر بن محمد خلیل بن شیخ احمد بن شیخ محمد بن شیخ بدرالدین[1] بن شیخ صدرالدین بن شیخ الاسلام شیخ ابوسعید شیخ جوہر انصاری[2]

حضرت مولانا کی ابتدائی عمر لہو ولعب میں گزری۔ تعلیم کی طرف بالکل توجہ نہیں تھی، کبوتر بازی وغیرہ تفریحات میں وقت گزرتا تھا کہ ایک روز مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپوری نے ایک شخص کے ذریعہ چند الفاظ کے معانی اور ایک مسئلہ دریافت

---

[1] بعض نسب ناموں میں شیخ بدرالدین کا واسطہ ذکر نہیں کیا گیا ہے جو بظاہر صحیح نہیں ہے۔

[2] حضرت شیخ ابوسعید شیخ جوہر انصاری۔ قطب عالم حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے ممتاز خلفاء میں تھے۔ مکتوبات قدوسیہ کا چوالیسواں مکتوب ان ہی کے نام ہے۔ مکتوبات قدوسیہ ص ۶۰ (دہلی، ۱۲۹۰ھ) سراج النسب ص ۹۶

کرایا۔ مولانا احمد علی اس وقت سولہ سترہ سال کے تھے اور کبوتر اڑانے میں مشغول تھے۔ قاصد نے آکر آواز دی اور حسب ہدایت سوالات کئے۔ مولانا احمد علی جواب نہیں دے سکے تو قاصد نے طنز کیا اور کہا ایسے برگزیدہ خاندان سے تعلق رکھتے ہو اور یہ حال ہے؟ ان الفاظ سے مولانا کے دل پر چوٹ لگی اور کبوتر وغیرہ اسی طرح چھوڑ کر گھر سے روپوش ہو کر نکل گئے۔ میرٹھ پہونچے۔ وہاں قرآن شریف حفظ کیا اور فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ میرٹھ سے کاندھلہ پہونچے اور حضرت مفتی الٰہی بخش سے تعلیم حاصل کی۔ مفتی صاحب سے کس سنہ میں تلمذ ہوا اور کیا کتابیں پڑھیں اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ صرف تذکرہ مفتی الٰہی بخش سے یہ مختصر سی اطلاع ملتی ہے کہ:۔

"ان حضرت نے اخیر عمر مفتی صاحب میں تحصیل شروع کی، اور حیات حضرت مفتی صاحب مرحوم میں انفراغ تحصیل علوم سے حاصل نہیں ہوا تھا۔ اتمام علوم کا حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب سے فرمایا ہے۔"[1]

حضرت مفتی صاحب کے وصال کے بعد دہلی چلے گئے تھے۔ وہاں طویل عرصہ تک قیام رہا اور مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ دہلی کب جانا ہوا اس کی صحیح تاریخ تو نہیں ملتی لیکن جب حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی سنہ ۵۰ - ۱۲۴۹ھ میں دہلی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے تو اس وقت مولانا احمد علی دہلی ہی میں تھے اور غالباً مولانا مملوک العلی سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ حضرت مولانا مملوک العلی نے حضرت حاجی صاحب کا گلستان کا سبق مولانا احمد علی کے سپرد فرمایا تھا۔[2]

حضرت مولانا نے چند کتابیں مولانا سعادت علی سہارنپوری سے بھی پڑھیں اور صحیح

---

[1] تذکرۂ مفتی الٰہی بخش مولفہ و مکتوبہ مولانا ریاض الحسن محمد سلیمان کاندھلوی متوفی ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۸ء۔ یہاں یہ وضاحت مفید ہوگی کہ حالات مفتی الٰہی بخش شامل اختتام مثنوی مطبوعہ کانپور اسی کا فارسی ترجمہ ہے۔

[2] شمائم امدادیہ صفحہ ۲۱ (لکھنؤ ۱۳۱۴ھ) امداد المشتاق صفحہ ۱۹۵ (تھانہ بھون ۱۳۰۹ھ)

بخاری کا اکثر حصہ مولانا وجیہ الدین صدیقی سہارنپوری[1] سے اخذ کیا۔
دہلی کے قیام میں حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی سے تلمذ و استفادہ کا موقع نہیں آسکا تھا کہ حضرت شاہ صاحب مکۂ مکرمہ ہجرت فرما گئے۔[2] اس شاخ طوبیٰ سے بلا واسطہ نسبت اور استفادہ حاصل کرنے کے لئے مولانا مملوک العلی کی رفاقت

---

[1] مولانا مفتی وجیہ الدین صدیقی سہارن پوری، سہارن پور کے خاندان قضاۃ سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت مفتی الٰہی بخش اور مولانا شاہ عبد الحئی بڈھانوی سے تعلیم حاصل کی۔ وسیع النظر عالم اور اس دور کے ممتاز اہل فتویٰ میں تھے۔
ابتداء میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہید سے سخت اختلاف رکھتے تھے اور تقویۃ الایمان کی رد میں کئی رسالے لکھے تھے جن میں سے ایک رسالہ کا جواب مولانا محمد حسن رامپوری (خلیفہ حضرت سید احمد شہید) نے لکھا تھا (اس جواب کا ایک خطی نسخہ ہمارے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے) تقویۃ الایمان کے بعض مباحث کے متعلق مولانا وجیہ الدین کا مولانا عبد اللہ کاندھلوی شاگرد مفتی الٰہی بخش سے مناظرہ ہوا تھا جس میں مولانا عبد اللہ غالب آئے۔ اور مولانا وجیہ الدین نے شاہ اسمٰعیل کی مخالفت سے توبہ کی۔ (ارواح ثلثہ ص۱۰۷) اور حضرت سید احمد شہید سے بیعت ہوئے۔ حضرت سید صاحب کے قافلے کے ساتھ ۱۲۳۷ھ میں حج کی سعادت حاصل کی اور حج کے بعد بھی حضرت سید صاحب کے ہمراہ رہے۔
حضرت شاہ محمد اسحاق کے ہجرت فرمانے تک حیات تھے۔ ربیع الاول ۱۲۶۰ھ سے پہلے وفات پائی۔ صحیح تاریخ وفات اور مفصل حالات دستیاب نہیں ہیں۔
[2] حضرت شاہ صاحب کے سنہ ہجرت کے متعلق سخت غلط فہمی پائی جاتی ہے سر سید احمد خاں کے بیان سے سنہ ہجرت ۱۲۵۶ھ معلوم ہوتا ہے۔ آثار الصنادید ۴/۵۹ (لکھنؤ ۱۹۰۰) یہی سنہ مولوی بشیر الدین نے واقعات دار الحکومت میں نقل کیا ہے ۲/۱۴۴ (آگرہ ۱۹۱۹ء) بعد کے اکثر تذکرہ نگار اور مورخین بلا تحقیق اسی پر اعتماد کرتے رہے ہیں اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے شاہ صاحب کا سنہ ہجرت

میں مکہ معظمہ کا سفر کیا اور ایک سال چند مہینے مکہ میں رہ کر شاہ محمد اسحاق سے صحاح ستہ کا درس لیا۔ اس سفر کے لئے مولانا مملوک العلی اور مولانا احمد علی ۲۶ رجب ۱۲۵۹ھ/۲۲ اگست ۱۸۴۳ء بروز پنجشنبہ مکان مملوک (کوچہ چیلان) دہلی سے روانہ ہوئے[۱] اور یکم ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ/ اواخر دسمبر ۱۸۴۳ء میں مکہ معظمہ پہونچے[۲]

۱۲۵۷ عیسوی بیان کیا ہے۔ حالات مولانا محمد قاسم ص۱ (بہاول پور ۱۲۹۷ء) مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے سفر ہجرت ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ دسمبر ۱۸۴۲ء میں شروع کیا۔ میر ظہور علی نے تاریخ کہی۔

مولوی اسحاق صاحب باکمال   ترک خانہ کردہ سوئے کعبہ رفت
سال تاریخش چنیں گفتہ ظہور   یک ہزار و دو صد و پنجاہ و ہشت
۱۲۵۸ھ

دوسری تاریخ خواجہ احسن اللہ نے کہی۔

مولوی اسحاق صاحب فخر دیں   تھا مشہور شہر جن کے نام سے
کر گئے ہجرت مع اہل و عیال   سوئے کعبہ شوق کے احترام سے
سچ تو یوں ہے جو کہ احسن نے کہا   شہر خالی ہو گیا اسلام سے

رسالہ احکام العید بن نواب قطب الدین دہلوی ص۱۲ (لکھنؤ ۱۲۹۰ھ)
اور یہی سنہ مولانا عبدالحئی حسنی نے نزہۃ الخواطر ۱/۷ (حیدر آباد ۱۳۸۷ھ) میں نقل کیا ہے۔

[۱] از بیاض حضرت مولانا احمد علی محدث سہارن پوری ورق ۲۹۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے مولانا مملوک العلی کا سفر حج ۱۲۵۸ھ میں ذکر کیا ہے۔ حالات مولانا محمد قاسم ص۱۔ یہی سنہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی ۱/۲۱۷ (دیوبند ۱۳۷۴ھ) میں جناب انوار الحسن صاحب شیرکوٹی نے انوار قاسمی ص۶۳ (لاہور ۱۳۸۹ھ) میں نقل کیا ہے اور مولانا محمد قاسم نانوتوی پر لکھنے والے تمام اہل قلم یہی سنہ نقل کرتے رہے ہیں۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اور حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں نیاز حاصل کیا۔ اور حج کی سعادت پائی۔
فراغ حج کے فوراً بعد درس کا سلسلہ شروع ہوا۔ حضرت مولانا کا معمول یہ تھا کہ فجر سے ظہر تک حدیث کی کتابیں نقل فرمایا کرتے تھے۔ اور ظہر کے بعد سے حضرت شاہ صاحب کی مجلس درس میں حاضر رہتے تھے۔ اسی مجلس میں صحاح کی تکمیل کی۔ صحیح بخاری۔ اور صحیح مسلم میں بعض حصہ کی قرأت اور بعض کی سماعت کی۔ سنن ترمذی کی تمام قرأت خود ہی کی۔ صحاح ستہ کی تکمیل کے بعد استاذ عالی مقام نے خدمت حدیث کی وصیت کی اور سند عطا فرمائی۔

حجاز سے کب واپسی ہوئی اس کی کوئی واضح شہادت نہیں ملی۔ تاہم حضرت مولانا کی بیاض میں رمضان ۱۲۶۲ھ/ اگست ستمبر ۱۸۴۶ء کے حسابات قرض وغیرہ کا اندراج ہے۔ جو سب دہلی کے اشخاص سے متعلق ہے۔ اس سے یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ رمضان سے کئی مہینہ پہلے سے دہلی میں قیام تھا۔

ہندوستان واپسی کے بعد دہلی میں مستقل قیام طے کیا۔ اور حدیث پاک کی کتابوں کی تصحیح و تحشیہ میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اور ان کی طباعت و اشاعت کے لئے ایک پریس خریدا۔ جو مطبع احمدی کے نام سے موسوم تھا۔ اس مطبع نے علم حدیث اور دوسرے فنون کی ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ یہ مطبع خصوصاً حدیث کے بنیادی متون کے عمدہ اور صحیح نسخے شائع کرنے میں ممتاز و منفرد مقام رکھتا تھا۔ تفصیلات

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)
مگر یہ صحیح نہیں ہے جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیاض مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ یہ غلطی شاہ محمد اسحاق کا سنہ ہجرت ۱۲۵۷ھ قرار دینے کی وجہ سے ہوئی صحیح یہ ہے کہ مولانا مملوک العلی نے ۱۲۵۹ھ میں سفر حج کیا۔ ۱۲۶۰ھ میں دہلی واپس لوٹے۔ اور محرم ۱۲۶۱ھ/ جنوری ۱۸۴۵ء میں مولانا محمد قاسم نانوتوی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دہلی پہنچے۔
ے اس سلسلہ کی تفصیلات انشاء اللہ مولانا احمد علی کے مفصل تذکرہ میں پیش کی جائیں گی

آئندہ سطور میں آرہی ہیں۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء / رمضان ۱۲۷۳ھ تک حضرت مولانا دہلی میں قیام پذیر رہے۔ اس دوران مولانا نے بہت سی کتابوں کی سخت محنت کے بعد تصحیح کی۔ اور ان کو اپنے پریس سے شائع کیا۔ کتابوں کی تصحیح اور اشاعت کے ساتھ ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ بھی برابر جاری رہتا تھا۔

جنگ آزادی میں جب پوری دلّی زیر وزبر ہوئی۔ قدیم عمارتیں بازار اور محلے کے محلے نیست ونابود ہوگئے تو مولانا کا پریس اس افتاد سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا وہ بھی اس طوفان کی زد میں آکر تباہ وبرباد ہوا۔ پریس ختم ہوجانے کے بعد حضرت مولانا اپنے وطن سہارنپور آگئے۔ اور گھر پر درس حدیث کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ تقریباً دو سال تک سہارن پور میں قیام رہا۔ اس کے بعد میرٹھ جاکر شیخ الٰہی بخش رئیس لال کرتی کے یہاں ملازم ہوگئے تھے۔

شیخ الٰہی بخش اور ان کے بھائی شیخ عبدالکریم[1] بہت بڑے تاجر اور ٹھیکیدار تھے پشاور سے کلکتہ تک تمام چھاؤنیوں میں ضروری سامان پہونچانے کا ٹھیکہ ان ہی کے پاس تھا۔ کلکتہ اور اس کے اطراف میں سامان پہونچانے کی ذمہ داری۔ اور ان نواح میں شیخ الٰہی بخش کے کاروبار کی نگرانی مولانا احمد علی کے سپرد ہوئی۔ اس ملازمت کے سلسلہ میں دس سال سے زیادہ عرصہ تک کلکتہ میں قیام رہا۔ درس حدیث کا سلسلہ وہاں

---

[1] شیخ الٰہی بخش اور شیخ عبدالکریم حقیقی بھائی اور شیخ مدار بخش کے صاحبزادے تھے۔ موضع اریل ضلع الٰہ آباد کے ایک نو مسلم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ مدار بخش الٰہ آباد سے ترک وطن کرکے میرٹھ آگئے تھے اور یہاں تجارت اور ٹھیکہ داری شروع کی۔ جسے بے حد ترقی ہوئی۔

شیخ الٰہی بخش نے ۴ر رجب ۱۳۰۰ھ / ۲۱ر مئی ۱۸۸۲ء میں وفات پائی اور شیخ عبدالکریم کا ۹ر رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ / ۷ر نومبر ۱۹۰۵ء کو انتقال ہوا۔ تفصیلات کے لئے رجوع فرمائیے صحیفۂ زریں ص ۲۰ تا ص ۲۱ جلد ۱۴۔ ۵ اکتوبر ۱۹۰۲ء وحیات بشیر از سید حبیب الرحمٰن (میرٹھ)

بھی جاری رہا۔ فجر سے ۹ بجے تک مسجد خیر الدین میں درس دیتے تھے اس کے بعد کاروباری معاملات دیکھتے تھے۔ اس ملازمت سے بقول علامہ شبلی نعمانی،

"مولانا احمد علی کو پانچ سو روپے ماہانہ کی آمدنی تھی" [۱]

اس ملازمت اور کلکتہ کے قیام کو دس بارہ سال ہو گئے تھے کہ حضرت مولانا حاجی عبدالکریم کی رفاقت میں حج کے لیے گئے۔ اس وقت حضرت حاجی امداد اللہ مکہ معظمہ میں قیام پذیر تھے اور وہ حضرت مولانا کے لئے اس ملازمت کو پسند نہیں فرماتے تھے، حضرت حاجی صاحب کی خواہش تھی کہ حضرت مولانا یہ ملازمت ترک کرکے اپنے تمام اوقات درسِ حدیث میں صرف کریں۔ حضرت مولانا اور شیخ عبدالکریم کی حضرت حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی تو حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا کے سامنے اپنے اس خیال کا اظہار کیا۔ اور ارشاد فرمایا۔

"مولانا مملوک العلی نے میرا سبق گلستاں آپ کے سپرد کیا تھا اس وجہ سے آپ میرے استاد ہیں۔ مگر میں ایک بات عرض کروں گا اگر ناگوار نہ ہو۔ انھوں نے فرمایا میں آپ کو اپنا بزرگ جانتا ہوں جو فرمایئے بسر و چشم منظور ہے میں نے کہا۔ آپ کا یہ منصب نہیں ہے کہ حافظ عبدالکریم وغیرہ آپ کو کام کا حکم دیں۔ بلکہ ان کو آپ کا محکوم ہونا چاہیئے۔ لیکن نوکری میں بجز محکومی چارہ نہیں۔ اب آپ اپنے مکان پر درس احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمایا کریں۔ تاکہ خلق کو فیض ہو۔ مولانا نے قبول کرکے فرمایا آپ حرم محترم میں میرے لئے دعا فرمائیں۔" [۲]

حضرت مولانا نے حضرت حاجی صاحب کے اس مشورہ اور ہدایت پر عمل کیا اور حج کے بعد کلکتہ کی ملازمت ترک کرکے سہارنپور آگئے اور گھر پہ درس حدیث کا سلسلہ

---

[۱] حیات شبلی علامہ سید سلیمان ندوی ص۸۶ (اعظم گڑھ ۱۹۷۰ء)

[۲] شمائم امدادیہ ص (لکھنؤ ۱۳۱۴ھ) امداد المشتاق ص۱۹۵، ۱۹۶

شروع کیا جس سے بہت فیض ہوا اور اس حلقہ درس نے حضرت حاجی صاحب کے الفاظ میں صدہا طلباء کو محدث بنا دیا۔

۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء میں کلکتہ سے سہارن پور واپسی ہوئی اس سے آٹھ سال پہلے رجب ۱۲۸۳ھ/ نومبر ۱۸۶۶ء میں سہارن پور میں ایک مدرسہ قائم ہو چکا تھا (جس کا نام ۱۲۹۶ھ میں حضرت مولانا نے مدرسہ مظاہر علوم تجویز کیا تھا) اس مدرسہ کو شروع سے ہی حضرت مولانا کی سرپرستی اور تعاون حاصل تھا۔ حضرت مولانا اس کی کارکردگی اور تمام معاملات سے واقف رہتے تھے۔ اور سالانہ نقد امداد (جس کی تعداد سو روپے سے تین سو روپے سالانہ ہوتی تھی) کے علاوہ اہم درسی کتابوں کے عطیے اور طلبار کے لئے وظیفے اور کھانے کی شکل میں بھی برابر معاونت فرماتے رہتے تھے۔

حضرت مولانا کے سہارن پور میں قیام کرنے کے فیصلے سے قدرتی طور پر کارکنان مدرسہ مظاہر علوم کو سب سے زیادہ خوشی ہوئی۔ مدرسہ کی سنہ ۱۲۹۱ھ کی رُوداد میں حضرت مولانا کی سہارنپور تشریف آوری۔ اور سلسلۂ درس حدیث شروع کرنے کی اطلاع شائع کی گئی ہے جس سے اہل مدرسہ کے حضرت مولانا سے تعلق اور حضرت مولانا کے درس حدیث کی غیر معمولی اہمیت اور مقبولیت کا علم ہوتا ہے مرتب روداد لکھتے ہیں۔

> طالب علموں وعلوم دینیہ کے شائقین کو مژدہ ہو کہ امسال مولوی احمد علی صاحب مد فیوضہ کلکتہ سے ترک تعلق کر کے سہارن پور میں مقیم ہیں غرض اصلی یہی ہے کہ جس قدر بن پڑے علوم دینی کے پڑھانے میں اوقات صرف کیجئے۔
>
> ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
> جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

چنانچہ طالب علم حدیث مسافت بعیدہ سے یہ مژدہ سُنکر فراہم ہو گئے اور کچھ مدرسہ مظاہر علوم کے طالب علم بھی ان سے پڑھتے ہیں۔ اکثر روز درس ...

تدریس میں گزرتا ہے بلکہ رات کو بھی بعض طالب علم پڑھتے ہیں۔ اور ان کے سہارن پور کے قیام سے کتابوں کی مدد بھی طالب علموں کو بہت ملتی ہے۔

ادام اللہ فیضہم و افاض علی العالمین برکتہ۔ [1]

حضرت مولانا ایک سال تک گھر پر ہی پڑھاتے رہے۔ ۱۲۹۲ھ سے مدرسہ میں درس دینا شروع کیا۔ مدرسہ کی سالانہ رُوداد میں اس درس کے شروع ہونے کا بہت پُرمسرت الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ درس وفات تک جاری رہا۔ حضرت مولانا مدرسہ میں بھی درس دیتے تھے اور گھر پر بھی طلبار کی ایک بڑی جماعت موجود رہتی تھی۔ ان طلبا کو بھی مختلف کتابیں پڑھاتے تھے۔ مکان پر مقیم اکثر طلبہ کے تمام اخراجات حضرت مولانا ادا کرتے تھے۔ اور مدرسہ کے متعدد طلبار کے خرچ اور کتابوں کی ضروریات بھی پوری فرماتے تھے۔

اسباق فجر کی نماز سے عشا کے بعد تک جاری رہتے تھے۔ کوئی وقت فارغ نہیں تھا۔ گھر سے مدرسہ جاتے ہوئے اور واپسی میں بھی طلبہ ساتھ ہوتے تھے۔ اس دوران بھی سبق ہوتا رہتا تھا۔ اور اسی طرح شام کو عصر کے بعد گھوڑے پر تفریح کے لئے جانے کا معمول تھا۔ اس وقت بھی طلبار ساتھ ساتھ دوڑتے اور سبق پڑھتے رہتے تھے۔ حضرت مولانا کے اخلاص۔ خدمتِ حدیث کی لگن اور طلبار کی محنت اور شوق و ولولہ کی وجہ سے ہر سال متعدد کتابوں کے دو۔ دو تین تین مرتبہ پڑھانے کی نوبت آتی تھی۔ مظاہر علوم کی سالانہ رو داد میں حضرت مولانا کی دوران سال پڑھائی ہوئی کتابوں کی تفصیل کئی مرتبہ شائع ہوئی۔ یہاں سنہ ۱۲۹۲ھ کی مقدار خواندگی نقل کی جاتی ہے۔

"صحیح مسلم تمام دو بار۔ سنن ابی داؤد مکرر۔ بخاری شریف تمام پھر گیارہ پارے۔ مشکوٰۃ شریف۔ نسائی ابن ماجہ۔ جامع ترمذی۔ موطا امام محمد

---

[1] روداد مدرسۂ مظاہر علوم سہارن پور سنہ ۱۲۹۱ھ ص ۳-۴

جامع صغیر۔ تفسیر جلالین۔ کلام مجید۔ احیاء العلوم ایک ربع۔ درمختار
صـ۳۲ تک۔ شمائل ترمذی۔ مقدمۂ ترمذی۔ شرح ملّا صـ۳۲ تک۔
قدوری"[1]

مولانا سعادت علی فقیہ کی وفات ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء کے بعد سے مدرسہ کے لئے کسی مہتمم کا انتخاب نہیں ہوا تھا اور یہ عہدہ خالی تھا۔ حضرت مولانا کے سہارن پور تشریف لانے کے بعد مدرسہ کے جلسۂ عام میں اتفاق رائے سے حضرت مولانا کو مدرسہ کا مہتمم تجویز کیا گیا اور اس سال ۱۲۹۱ھ کی رُوداد پر بحیثیت مہتمم حضرت مولانا کا نام شائع ہوا۔

حضرت مولانا کا دارالعلوم دیوبند سے بھی خاص تعلق رہا ہے۔ دارالعلوم کے ابتدائی دور کے متعدد کارکنان اور اساتذہ حضرت مولانا سے شاگردی کی نسبت رکھتے تھے۔ اور دارالعلوم کی سب سے پہلی عمارت "نودرہ" کا سنگ بنیاد بھی حضرت مولانا کے ہاتھ سے رکھا گیا۔ روداد مدرسہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند میں اس تاریخی واقعہ کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

"اول پتھر بنیاد کا جناب مولانا مولوی احمد علی صاحب نے اپنے دست مبارک سے رکھا۔ اور بعد میں جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب و مولانا مولوی رشید احمد صاحب اور مولانا مولوی محمد مظہر نے ایک ایک اینٹ رکھی"[2]

حضرت مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ جس کے لئے برصغیر ہند و پاک کے تمام اہل علم حضرت مولانا کے ممنون احسان ہیں۔ حدیث کی کتابوں کی تصحیح اور ان کی اشاعت ہے۔ حضرت مولانا نے صحیح بخاری۔ جامع ترمذی اور مشکوٰۃ المصابیح پر حاشیے لکھے اور ان کی تصحیح کی۔ صحیح مسلم کی بھی تصحیح کی۔ اور پہلی بار شرح نووی کے ساتھ شائع کی۔ سنن ابی داؤد

---

[1] رُوداد مدرسۂ مظاہر علوم سہارن پور سنہ ۱۲۹۲ھ ص۵
[2] سوانح قاسمی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی ۳۲۵/۲ (دیوبند ۱۳۵۷ھ)

کے کئی نسخے سامنے رکھ کر صحیح نسخہ تیار کیا جسے مولانا کے خاص شاگرد مولانا محمد حسین نقیر دہلوی نے بہت اہتمام سے شائع کیا۔

اس عقد ثریا کا گوہر شب تاب حاشیہ صحیح بخاری ہے۔ حضرت مولانا نے اس کی تصحیح اور حاشیہ لکھنے میں غیر معمولی کاوش و کوشش فرمائی۔ متعدد ممتاز علماء سے اس میں مدد لی اور خود بھی دس سال سے زیادہ عرصہ تک اسی صورت میں مصروف رہے۔

اس بیش بہا تاریخی نسخے کی پہلی طباعت[1] سید عبد الغفور (برادر سرسید احمد خاں) کے مطبع سید الاخبار میں ۱۸ جمادی الآخر ۱۲۶۴ھ/۲۳ مئی ۱۸۴۸ء کو شروع ہوئی اس پریس میں صرف ایک سو چوراسی صفحات چھپے تھے کہ مولانا نے طباعت کا کام اپنے مطبع احمدی میں منتقل کر لیا۔ ص ۱۸۵ سے آخر تک دونوں جلدیں مطبع احمدی ہی سے شائع ہوئیں جلد اول کی طباعت ۲۷ رجب ۱۲۶۷ھ/۱۵ مئی ۱۸۵۱ء کو اختتام پذیر ہوئی۔ اور دوسری جلد کی اشاعت ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں تکمیل کو پہونچی۔ اس ایڈیشن کے کل تین سو پچیس نسخے شائع ہوئے اور فی نسخہ بارہ روپے لاگت آئی[2]۔ اس طباعت کا دوسرا ایڈیشن مطبع عبد الغفور دہلی سے محرم ۱۲۷۲ھ/ستمبر اکتوبر ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا۔

---

[1] عام طور پر خیال ہے کہ ہندوستان میں حدیث کی کتابیں سب سے پہلے حضرت مولانا احمد علی نے طبع کرائیں۔ اس سے پہلے یہاں حدیث کی کتابوں کی اشاعت نہیں ہوتی تھی۔ مگر یہ خیال درست نہیں ہے۔

راقم سطور کی معلومات کے مطابق ہندوستان میں حدیث کی کتابوں میں سب سے پہلے ۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء میں مطبع سلطانی قلعۂ معلیٰ دہلی سے سنن نسائی شائع ہوئی اس کا ایک نسخہ ہمارے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہے۔ سنن نسائی کے بعد ۱۲۶۲ھ میں موطا امام محمد شائع ہوئی۔ یہ نسخہ بھی راقم کی نظر سے گزرا ہے مگر اس وقت سامنے نہیں ہے۔ اس کے بعد ۱۲۶۵ھ میں کلکتہ سے صحیح مسلم شائع ہوئی۔ اس اشاعت کا بھی ایک نسخہ ناچیز نے دیکھا ہے۔ اور "کفاء القنوع بما هو مطبوع" ص ۱۲۶ (مصر ۱۳۱۳ھ) میں بھی اس کا ذکر ہے۔

[2] یہ معلومات حضرت مولانا کی بیاض اور ان ایڈیشنوں کو سامنے رکھ کر اخذ کی گئی ہیں۔

اس طباعت کے بعد بھی حضرت مولانا نے صحیح بخاری کی تصحیح اور اس پر نظر ثانی کا کام جاری رکھا، پچھلے ایڈیشن میں جو غلطیاں رہ گئی تھیں اُن کی موقع پر تصحیح کی ما ورحواشی میں بھی کسی قدر اضافہ ہوا سب سے اہم اضافہ رجال کے انساب اور کُنی کا ہوا۔ اس نسخہ کی ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء میں طباعت شروع ہوئی اور ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۷ء میں پوری ہوئی۔

صحیح بخاری کی پہلی اشاعت کے خاتمۃ الطبع میں حضرت مولانا نے صحیح مسلم کی طباعت شروع کرنے کا ذکر کیا ہے۔ غالب گمان ہے کہ ایک دو سال میں اس کی طباعت مکمل ہو گئی ہو گی، یہ ایڈیشن طباعت کے بعد جلد ہی ناپید ہو گیا تھا، اور اس وقت تک راقم السطور کو اس کے کسی نسخہ کا سُراغ نہیں ملا، اس ایڈیشن کے فروخت ہو جانے کے بعد صحیح مسلم کا دوسرا ایڈیشن مولانا محمد حسین فقیر اور شیخ ظفر علی کے اہتمام سے مطبع افضل المطابع شاہدرہ دہلی سے شائع ہوا۔

تیسری اہم کتاب جس پر حضرت مولانا نے حاشیہ لکھا اور اس کی تصحیح کی جامع ترمذی ہے جامع ترمذی کا پہلا ایڈیشن حضرت مولانا کی تصحیح اور حاشیہ کے ساتھ ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء میں مطبع العلوم دہلی سے اشرف علی واسطی کے اہتمام سے شائع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن رمضان ۱۲۸۲ھ/ جنوری فروری ۱۸۶۶ء میں مطبع احمدی میں چھپنا شروع ہوا، اور رجب ۱۲۸۳ھ نومبر ۱۸۶۶ء میں پورا ہوا۔

متون حدیث کی ان اہم کتابوں کے علاوہ حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح پر بھی حاشیہ لکھا اور اپنے مطبع سے شائع کرایا مگر حضرت مولانا کو ہمیشہ اس کا افسوس رہا کہ مشکوٰۃ کی پوری خدمت نہیں ہو سکی۔

مشکوٰۃ کا پہلا اڈیشن کب شائع ہوا اور اس کی کیا اہمیت تھی، افسوس ہے اس کی تفصیل حاصل نہیں ہو سکی، دوسرا ایڈیشن مطبع احمدی سے ۱۲۷۲ھ میں شائع ہوا اس ایڈیشن کے متعلق یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس کو مفت تقسیم کرنے کے لئے شائع کیا گیا تھا، اس نسخہ کی پہلی جلد کے ٹائیٹل اور پہلے صفحہ پر جلی قلم سے "الوقف للہ الکریم" اور دوسری جلد کے اکثر صفحات پر "الوقف" چھپا ہوا ہے۔

حدیث کی کتابوں کی اس جلیل القدر خدمت کے علاوہ مولانا کے متعدد خطبے، فتاویٰ اور ایک تالیف بھی یادگار ہے۔ یہاں صرف تالیف "الدلیل القوی علی ترک قراءۃ المقتدی"

کا ذکر کیا جاتا ہے۔

یہ کتاب قراءۃ خلف الامام کے موضوع پر مولوی محمد شاہ لدھیانوی کے اصرار پر تالیف فرمائی ہے۔ اس میں نہایت متین اور علمی انداز سے فارسی زبان میں قراءۃ خلف الامام کے متعلق علماء حنفیہ کا نقطۂ نظر واضح کیا گیا ہے پیش نظر نسخہ شعبان ۱۲۷۰ھ / مئی ۱۸۵۴ء میں مطبع احمدی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ اس کے بعد کم از کم ایک مرتبہ اور چھپا ہے۔

بعض احباب کے اصرار پر خود حضرت مولانا نے اس رسالہ کا اردو ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ بھی اسی نام "الدلیل القوی علی ترک قراءۃ المعتدی" سے رجب ۱۲۹۵ ہجری جولائی ۱۸۷۸ء میں مطبع رحیمی واقع سرائے نواب علی محمد خاں (۹) سے شائع ہوا۔

حضرت مولانا نے ان درسی اور تصنیفی خدمات کے ساتھ ہی مسلمانوں کی اصلاح اور معاشرہ کی درستی کے لئے بھی مسلسل جد و جہد کی خصوصاً بدعات کی بیخ کنی۔ اور بیواؤں کا نکاح نہ کرنے کی مشرکانہ رسم کو ختم کرانے کے لئے بہت کوشش کی۔ ان موضوعات پر فتاویٰ لکھے۔ انھیں شائع کرایا۔ اور مختلف علاقوں کے سفر کرکے وعظ و نصیحت کے ذریعہ عوام کو بدعات و رسومات کی برائی اور ان کے نقصانات سے آگاہ کیا۔ اور صحیح اسلامی طریقہ اور سادہ چلن پر زور دیا

حضرت مولانا کے معاصرین میں شاید ہی کسی استاذ و محدث کو اتنی بڑی تعداد میں ایسے منتخب اور بلند مرتبہ شاگرد میسر آئے ہوں جیسے حضرت مولانا کو ملے۔ حضرت مولانا کے تلامذہ کی فہرست خاصی طویل ہے۔ تقریباً ساٹھ شاگردوں کے نام اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ اس فہرست میں سے صرف چند نام ذکر کئے جاتے ہیں حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی مولانا محمد مظہر نانوتوی۔ مولانا عبد اللہ انصاری انبہٹوی۔ مولانا احمد حسن امروہوی۔ مولانا عبد العلی میرٹھی۔ مولانا محمد علی مونگیری (بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ) علامہ شبلی نعمانی۔ اور حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی۔ حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا سے گلستان

پڑھی۔ تفصیلات گزشتہ سطور میں گزر گئی ہیں۔

حضرت مولاناؒ ۱۲۹۷ھ کے شروع میں مرض فالج میں مبتلا ہوئے۔ اور اسی مرض میں ۶ جمادی الاول ۱۲۹۷ھ/ اپریل ۱۸۸۰ء شنبہ کے روز سہارن پور میں وفات پائی۔ ناسخ نے تاریخ کہی۔

چوں آں احمد علی نیک باطن ‏ بسوئے خلد زیں دار الفنا رفت
برائے سال ترحیلش بہ ناسخ ‏ فلک گفتا ز دنیا مقتدا رفت[1]

---

[1] تلامیذ غالب۔ جناب مالک رام ص۵۳۰ (نکودر ۱۹۵۸ء)

نوٹ:- از نور الحسن راشد۔ اس مضمون میں حضرت مولانا کی سوانح کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ناچیز کو احساس ہے کہ اس میں بہت سی باتیں تشنہ اور وضاحت طلب رہ گئی ہیں۔ ان کی توضیح و تفصیل کے لئے حضرت مولانا کی مفصل سوانح کا انتظار فرمائیے جو ان شاء اللہ عنقریب پیش کی جائے گی۔
